جائیں گی جن کا تخصص تو کسی اور صنف میں ہے لیکن جنہوں نے اس تخصص کے ساتھ ساتھ دوسری اصناف کو بھی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔

ع س مسلم کا واحد افسانوی مجموعہ ''ایک ٹہنی کے پھول'' چودہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ کتاب اگرچہ 1957ء میں شائع ہوئی لیکن اس میں شامل افسانے کم وبیش دس گیارہ برس کے عرصے میں لکھے گئے۔ مصنف نے ہر افسانے کے آخر میں ہر کہانی کا سنِ تحریر رقم کیا ہے، جس سے یہ بات جاننے اور ان افسانوں کا مجموعی مزاج سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملتی ہے۔ یہ افسانے 1946ء سے 1957ء کے عرصے میں ہی تحریر ہوئے ہیں۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ع س مسلم کی افسانہ نگاری کا جائزہ لینے سے پہلے اُردو افسانے کی روایت پر مختصر سی نظر ڈال لی جائے۔ تاکہ اِن افسانوں کا مقام و مرتبہ متعین کرنے میں مدد مل سکے۔

اُردو افسانے کی ابتداء تقریباً ایک صدی پرانی ہے۔ اگرچہ ایک صدی سے پہلے بھی اُردو میں کچھ ایسی تحریریں دستیاب ہوئی ہیں جن پر کہانی کا گمان گزرتا ہے اور جن کی تخلیق انیسویں صدی کے آخری ربع میں ہوئی، لیکن عام طور پر اس کا آغاز منشی پریم چند سے کیا جاتا ہے جن کی ابتدائی تحریریں انیسویں صدی کے پہلے عشرے میں سامنے آئیں۔ اُنہوں نے اپنے معاشرتی مسائل کو اِردگرد کی زندگی کے حوالے سے دیکھا، اور یوں ایک ایسی سماجی حقیقت نگاری پر مشتمل کہانیوں کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا جو اُردو افسانے کو صحیح معنوں میں افسانہ آشنا کرنے کا سبب بنیں۔ کہانی سے افسانے تک کا یہ سفر زیادہ تر گتھے ہوئے پلاٹ کے سبب تھا جو پریم چند کے تخلیقی عمل کے سبب اُردو میں ظاہر ہوا۔ اِس سے پہلے کہانیاں اُردو افسانے کی سائنٹفک تعریف سے کچھ دُور کی چیز معلوم ہوتی ہیں۔ پریم چند کے افسانے خاص طور پر: ''بڑے گھر کی بیٹی'' - ''نشہ'' - ''ماں کا دل'' - ''زیور کا ڈبہ'' --- اُردو کے ابتدائی خوبصورت افسانے ہیں جو پریم چند کے قلم سے صفحہ قرطاس پر اُترے۔ اُنہوں نے آخری دنوں میں ''کفن'' جیسی لازوال کہانی تخلیق کی جو فکر و فن، مواد، ہیئت اور تاثیر کے حوالے سے ایک زندہ و جاوید کہانی قرار دی گئی۔

پریم چند کے بعد کی نصف صدی میں اُردو افسانہ نگاروں کی صف میں بہت سے نئے افسانہ نگار شامل ہو گئے، مثلاً سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش وغیرہ۔ اِن میں سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں جذبے اور احساس کو اِس طرح سے پرویا گیا ہے کہ کہانی زندگی کے قریب رہتی ہے۔ خاص طور پر اُنہوں نے مغرب کی تعلیم و تہذیب کے فریب سے قاری کو محفوظ رکھنے کے لیے کئی کہانیاں لکھیں۔

اِسی زمانے میں کہانی کو زندگی کے نفسیاتی تقاضوں کے قریب رکھنے کے لیے کچھ ایسی کہانیاں بھی سامنے آئیں جن میں تخیلاتی اور جذباتی طرزِ احساس کے ساتھ ساتھ روحانی اور ماورائی عناصر کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ اِن کہانیوں کی نمائندہ کتاب سجاد حیدر یلدرم کی ''خیالستان'' ہے اُن کے افسانوں پر ترکی تہذیب و معاشرت کے اثرات بھی نمایاں ہیں اگرچہ اُن کا غالب رُجحان رومانویت کے قریب ہے مگر اُسے ہم جبلّی اور جنسی رُجحانات سے کُلی طور پر الگ نہیں کر سکتے۔ نیاز فتح پوری کے ہاں بھی رومانیت ملتی ہے۔ وہ بھی یلدرم کی طرح فن میں مقصدیت کے قائل نہیں تھے۔ اِن دونوں کو وکٹورین عہد کے

جمال پرست کہانی نگاروں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ل احمد اکبرالہ آبادی اور مجنوں گورکھپوری نے بھی اِسی دور میں کچھ کہانیاں لکھیں مگر بحیثیت مجموعی افسانے میں کوئی تاریخی اضافہ نہیں کیا۔

کچھ اور افسانہ نگاروں: سدرشن، علی عباس حسینی، حامد علی افسر، محشر عابدی، عظیم بیگ چغتائی اور ذوقی وغیرہ کے افسانے بھی اِس زمانے میں ملتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی افسانے کے اِس دورِ اوّل میں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری زیادہ معروف نظر آتے ہیں۔ علی عباس حسینی نے بھی پریم چند کے اسلوب کو ہی اپنایا۔ تیسری دہائی 1930ء کے بعد اختر حسین رائے پوری، حامد علی خان، جلیل قدوائی، منظور حسین اور مظفر قریشی نے اُردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اِسی دَور میں ''انگارے'' کی اشاعت نے اُردو افسانے میں ایک رُجحان ساز تبدیلی پیدا کی۔ اِس کتاب کا مقصد جہاں نئی انسانی قدروں کی تعبیر تھا وہاں پُرانی رُجعت پسندانہ قدروں اور فرسودہ روایات کی تخریب بھی تھا۔ ان افسانہ نگاروں میں سجاد ظہیر، احمد علی اور رشید جہاں وہ افراد ہیں جنہوں نے ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھایا۔ اُنہوں نے ہیئت پرستی، ادب، مقصدیت، رومانویت اور زندگی سے بے تعلقی کو ادب کے لیے ایک جُرم قرار دیا۔ ''انگارے'' کی اشاعت کا مقصد ادب کو ایک واضح رُخ عطا کرنا تھا۔ جو زندگی کو رومانویت کے دھندلکوں سے نکال کر حقیقت پسندی کی طرف لے جائے۔

خاص طور پر ایسی حقیقت پسندی جس کے ڈانڈے اشتراکیت کے ساتھ ملے ہوئے ہوں۔ اِس تحریک کے اثرات کم و بیش بعد میں آنے والے تمام افسانہ نگاروں پر پڑے۔ کچھ نے اِن اثرات کو قبول کیا اور کچھ نے ترقی پسند تحریک کے ردِعمل کے طور پر اپنے خیالات اور واردات کو افسانے کی شکل دی۔ اِن ملے جُلے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، حسن عسکری، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، مہندر ناتھ، رضیہ سجاد ظہیر، بلونت سنگھ اور غلام عباس شامل ہیں۔ بعد میں اِن ناموں میں انتظار حسین، ممتاز مفتی اور ممتاز شریں کے نام قابلِ ذِکر ہیں جنہوں نے سنجیدگی کے ساتھ اپنی تخلیقی شخصیت کو افسانے کے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے افسانے کے میدان میں کچھ شخصیات جو خاموشی کے ساتھ داخل ہوئیں اُن میں ایک نام ہمارے افسانہ نگار ع س مسلم کا بھی ہے۔ اُنہوں نے ناموری اور شہرت کی خواہش سے بے نیاز ہو کر اپنے اندر کی واردات کے دباؤ پر افسانے لکھے۔ جیسا کہ وہ اپنی کتاب ''ایک ٹہنی کے پھول'' کے آغاز میں ہی اظہار کرتے ہیں کہ میری یہ کہانیاں دنیا کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے لکھی گئی ہیں۔ یہ بات اپنے اندر نہ صرف ایک انفرادیت لیے ہوئے ہے بلکہ ایک خاموش اور سچے فنکار کی نشانی کے طور پر ایک گہری معنویت کی حامل بھی ہے۔ دنیا کا بہت سا ادب ایسا بھی ہے جو اپنے تخلیقی دباؤ کے سبب لکھا گیا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح نام ونمود کی آرزو سے بے نیاز فن پارے جو ہمیں ''اجنتا'' اور ''الورا'' کی غاروں میں ملتے ہیں، یا حسیات کی فضا میں لکھی گئی تحریریں جن کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچتی ہے۔

اصولِ تنقید میں تخلیقی محرکات کے ذیل میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ فنکار کیوں لکھتا ہے---؟ ذوقِ داستان

سرائی، نمائشیت، نظریہ اظہار، یا نظریہ الہام--- آخر وہ کونسی قوت ہے جو فنکار کو اپنی داخلی واردات اور خارجی مشاہدات کے اظہار پر اُکساتی ہے۔ اِس کتاب کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ کہانیاں، لکھنے والے پر ایک تخلیقی دباؤ کی طرح نازل ہوئیں اور اُنہوں نے اِنہیں اپنی تخلیقی کارکردگی کا مستقل اور باقاعدہ حصہ نہیں بنایا بلکہ جب کبھی اُنہیں کسی کہانی نے اپنی گرفت میں لیا تو اُنہوں نے اُسے کاغذ پر اُتار دیا۔ اُن کا یہ عمل افسانہ نگار کہلانے کی غرض سے نہیں تھا، بلکہ اِن کہانیوں نے خود کو اُن کے ذریعے کہلوایا بقول نظیری:

تو مپند ار کہ ایں نغمہ ز خود می گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازی ہست

یعنی یہ نہ سمجھ کہ یہ نغمہ میں خود کہہ یا الاپ رہا ہوں۔ اپنے کان میرے ہونٹوں کے نزدیک لا کہ یہاں سے ایک آواز آ رہی ہے۔ ع س مسلم کے افسانے جس سماجی تہذیبی اور ثقافتی فضا کی پیداوار ہیں یہ فضا قیامِ پاکستان سے کچھ سال پہلے شروع ہوئی اور قریب قریب دو عشروں تک قائم رہی--- یعنی تقریباً دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے سقوطِ ڈھاکہ تک۔ یہ زمانہ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اہم زمانہ ہے--- آزادی کے خواب--- ان خوابوں کی عملی شکلیں--- اور پھر ان کی بنتی بگڑتی صورت گری--- جس نے تقریباً زندگی کے ہر شعبے پر اثر ڈالے اس عہد نے بہت سے دلوں اور احساس و خیال کی موجوں پر اپنا سکہ یوں جمایا کہ یہ پورا عہد تداخل (درمیانی وقت)، حساس قلمکاروں کی تخلیقی تحریروں میں مختلف زاویوں سے بار بار اپنا سر اٹھاتا رہا۔ اِس کے اثرات عام طور پر تین طرح سے ظاہر ہوئے ہیں ذاتی سطح پر--- علاقائی سطح پر--- اور تیسرا آفاقی سطح پر۔

اگر ع س مسلم کے افسانوں کے مضامین کا گہرائی میں جا کر تجزیہ کیا جائے تو ان کے موضوعات کے تانے بانے اپنی امکانی وسعتوں میں ان تین دائروں سے متعلق ہیں۔ ان کے افسانوں نے جس ماحول میں اپنے تخلیقی سفر کو طے کیا یہ ماحول اردو افسانہ نگاری کا ایک بڑا اہم دور ہے۔ اس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے پابند پلیٹ فارم سے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی تخلیقات بھی سامنے آئیں۔ مذہبی ذہن رکھنے والے مثلاً نسیم حجازی، ایم اسلم، میم نسیم وغیرہ کی تخلیقات کا زمانہ بھی اس میں شامل ہے۔ اسی زمانے میں بعض آزاد رو اہم افسانہ نگار بھی سامنے آئے جن میں سعادت حسن منٹو سرفہرست ہے۔

ع س مسلم کے ہاں ہمیں موضوعات کا وہ تنوع تو نظر نہیں آتا جو جدید اُردو افسانے کی بنیاد بنا لیکن 1946ء اور 1955ء کے عرصہ میں لکھے گئے یہ افسانے موضوعاتی اعتبار سے اپنے عہد کے بہترین عکاس ہیں۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل معاشرے میں جو سیاسی، معاشی، معاشرتی، جذباتی اور نفسیاتی مسائل عام تھے اور پھر قیامِ پاکستان کے بعد جنم لینے والے مسائل--- ہجرت--- فسادات--- بدامنی--- وسائل کی کمی--- اور اس سے متعلقہ موضوعات، جن کو اُردو افسانہ نگاروں نے ایک تواتر سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا، ع س مسلم کے ہاں بھی ہمیں یہ موضوعات کسی حد تک نظر آتے ہیں کہ یہ وقت کا تقاضا تھا۔ ''اور چیونٹیاں رینگتی رہیں'' بھی اِسی المیے کی کہانی ہے۔ جس نے تقسیمِ ہند کے نتیجے میں جنم لیا۔ یہ کہانی فروری 1948ء

کے قریب لکھی گئی۔ یہ کہانی قیامِ پاکستان کے اعلان کے فوراً بعد فسادات، اغوا، اور تبادلہ آبادی کے نتیجے کے طور پر ہونے والے کربناک واقعہ پر مشتمل ہے۔

ایسی کہانیاں سعادت حسن منٹو، قدرت اللہ شہاب، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور دوسرے کئی لوگوں نے لکھیں۔ لیکن یہ کہانی جو بیانیہ تکنیک میں لکھی گئی ہے ایک ہی سانس میں ختم کی گئی کہانی نظر آتی ہے۔ ایک ہی سانس میں کہی جانے والی کہانی سے میرا مطلب یہ ہے کہ کہانی کار کہانی کی اندرونی صداقتوں سے اِس طرح آمادۂ تحریر ہے کہ وہ اِس کربناک صورت حال کو جلد از جلد بیان کر دینا چاہتا ہے۔ تاثیر کی گرفت قاری کو بھی کہانی پڑھنے پر مجبور رکھتی ہے اور وہ چند صفحوں میں سماجی، اخلاقی، تہذیبی قدروں کی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ کئی انسانی رویوں کی مختلف شکلیں دیکھتے ہیں۔ اس کہانی کے آغاز میں مصنف نے انسان کو حرکت اور عمل پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن چیونٹوں کے اس بیان کے ساتھ ہی اُنہوں نے واقعات کی افسانوی بنت میں اُن دِنوں کی سچی تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ جب انسان نے اپنی انسانیت کو بھلا کر شیطانیت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ کہانی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ شاید اُسی دانہ گندم کا اثر تھا، جو آدم نے کھایا تھا اور جواب اس کے بیٹوں کی رگ و پے میں شیطنت و شہوانیت کی ایک بجلی بنا ہوا تھا۔ یہ بجلی اُن کی فطرت بن کر رہ گئی تھی، جو اپنی تمام قوتوں کے ساتھ انسانیت کو تباہ کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔ ہر آشیانے پر یہ ایک نئے بھیس میں گرتی تھی --- آزادی کے بھیس میں --- امن کے فرشتہ ملبوس میں --- سائنس کے پرلگا کر --- کہیں جمہوریت کا لبادہ اوڑھ کر گرتی، کہیں شرکتِ عامہ کی اوٹ میں نازل ہوتی، کہیں تلواروں کی چمک میں مدغم ہو کر مقدس جنگ کے بہانے سے انسانیت پر وار کرتی۔ اور کہیں تہذیب کے روپ میں سج دھج کر ایک نئی چمک دمک کے ساتھ انسانی ضمیروں کا خون کرتی''۔ (''اور چونٹیاں رینگتی رہیں''، ص 227)

یہی ایک کہانی ہمارے افسانہ نگار کو ایک کامیاب افسانہ نگار ثابت کرنے کے لیے کافی ہے --- ایک اور اہم موضوع جس کو ع س مسلم نے اپنی کہانیوں میں سماجی رکھ رکھاؤ کے ساتھ برتا ہے وہ آغازِ بلوغت کے سنسنی خیز احساسات و جذبات ہیں۔ مصنف خود اِس موضوع کے بارے میں لکھتا ہے:

'' 'ایک ٹہنی کے پھول'، 'اور نہ کر ظالم فنا مجھ کو' میں مَیں نے اُردو کے افسانوی ادب میں ایک نیا موضوع پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس موضوع پر کوئی کہانی کم از کم میری نظر سے ابھی تک نہیں گذری --- نوجوان ذہنوں میں ابتدائے بلوغت کے احساسات جو طوفان اُٹھاتے ہیں، ان دونوں کہانیوں اور 'مغل' میں ان کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے،، (حرف اول)

نوجوان لڑکوں کے ذہنوں میں آنے والا جذباتی اُبال اور جنسی میلانات کو موضوع بنانے کے حوالے سے مصنف کا یہ دعویٰ اِس طرح سمجھ میں آتا ہے کہ مصنف یہ بات 1956ء میں کر رہا ہے۔ اگرچہ بعد ازاں اس موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے ادب کے علاوہ فنونِ لطیفہ کے دیگر ذرائع بھی استعمال کیے گئے۔ مگر پچاس ساٹھ سال پہلے اس موضوع کو زیرِ بحث لانا اور

پھر اس سلیقے سے کہ کہیں بھی اخلاقیات کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے کچھ ہمارے باکمال مصنف ہی کا کام تھا۔ سرورق کہانی ''ایک ٹہنی کے پھول'' سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''بات کہنے والوں کا منہ تو کوئی بند نہیں کر سکتا، یہ حقیقت تھی، کہ وہ دونوں اب تک کنواری کلیوں کی طرح پاک تھے، جن کی خوشبو تو روش روش پھیلی ہوئی تھی، لیکن ابھی تک کسی نے انہیں سونگھا تک نہیں تھا۔ اور پھر ان کا اپنا ماحول اور تمدن بھی یہ تھا کہ کوئی عملی بداحتیاطی تو کیا ذہنی پراگندگی تک بھی گناہ سمجھی جاتی تھی، اور دوسری طرف ابتدائے بلوغت اور عروجِ محبت کا زمانہ--- جذبات کو کوئی نکاس نہ ملتا تھا، وہ ملتے بھی اور جدا بھی ہوتے، لیکن ایک تشنگی سی ہمیشہ باقی رہتی۔ اور ایک دوسرے کے موجود ہوتے ہوئے بھی اس تشنگی کی تسکین جب نہ ہوتی، تو آنکھوں میں یاس اور آرزو سے ملے جلے جذبات آبدیدہ سے ہو کر ایسے ڈھلک پڑتے جیسے فوراً بغلگیر ہو کر ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں گے، اور ان کے پتلے گلابی ہونٹوں پر جو ابھی ابھی گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح تر و تازہ ہوتے، پپڑیاں سی جم جاتیں، اور ان پر ایک عجیب مبہم سی کپکپی طاری ہو جاتی۔ ایسے وقت میں وہ ایک دوسرے کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر فوراً جدا ہو جاتے۔ اور آئندہ ملاقات تک ایسے وقت گزارتے جیسے برسوں سے میل نہ ہوا ہو، جیسے رگ رگ میں ایک برقِ تپاں دوڑ رہی ہو، اور کسی کل چین نہ پڑتا ہو۔ (''ایک ٹہنی کے پھول''، ص 88)

''ایک ٹہنی کے پھول'' کے دیگر افسانوں کے موضوعات اِس دَور کے اُن افسانوی رجحانات پر مشتمل ہیں جو عصری آگہی اور بدلتے ہوئے شعور کا آئینہ دار تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے آپ کو پچاس ساٹھ سال پیچھے جانا پڑے گا جب قراردادِ پاکستان کے بعد دوسری عالمگیر جنگ اور پھر قیام پاکستان اور اُس کے بعد حالات اتنے بڑے واقعات تھے جو اِن سالوں میں رونما ہوئے۔ اُن ارتعاشات نے نہ صرف آنے والی دہائیوں کو متاثر کیا بلکہ اگر ہم اِس خطے کے سیاسی اور سماجی رویوں کا غور سے جائزہ لیں تو ہمیں ان کے اثرات کسی نہ کسی شکل میں اب تک کے ادب پر نظر آتے ہیں۔ یہ دَور افسانہ نگاری میں نفسیاتی حوالے سے کردار نگاری کا دور تھا۔ افسانہ نگاروں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ اظہار کے پیرائے میں پیش آنے والے مسائل کو اس طرح افسانوی انداز میں پیش کریں کہ کہانی کا پھیلاو اور وسعت کرداروں کے عمل اور مکالمے سے آگے بڑھے۔ اِس زمانے میں مغربی تعلیم کے زیر اثر پیچیدہ کردار نگاری کی مثالیں عام نظر آتی ہیں، سامنے کے بعض بڑے اچھے کردار منفی کاموں میں مشغول نظر آتے ہیں جبکہ بعض آوارہ گرد اور منفی کردار اپنے عمل سے ہمیں خیر اور نیکی کی منزلوں کا راستہ دکھاتے ہیں۔

اِس قسم کے کرداروں کو انگریزی میں پکارسک (Picaresque Character) کہتے ہیں۔ دراصل یہ لفظ ہسپانوی زبان سے انگریزی میں آیا جہاں پکارو کردار Picaro Character کے معانی 'شورہ پشت، سرکش یا باغی کے ہیں۔ چالیس پچاس کی دہائی میں جب برِصغیر ایک بہت بڑے تہذیبی آشوب سے گزر رہا تھا اِن دِنوں میں سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے ہاں کہانیوں میں ایسے بے شمار کردار دیکھے جا سکتے ہیں۔ ع س مسلم کا اِس زمانے میں کہانی کی طرف راغب ہونا ہی اُن کی زندگی کا غور طلب مسئلہ ہے۔

گزشتہ دنوں میں نے ان کی کہانیوں کو کئی حوالوں سے پڑھا اور کئی حوالوں سے یہ کہانیاں زیر بحث آئیں۔اس مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ یہ کہانیاں لکھنے سے اِن کا واحد مقصد بعض ایسے مسائل کا بیان تھا جنہیں وہ کسی اور صنف میں پیش نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ایک تخلیقی سچائی ہے کہ ہر موضوع اپنی ہیئت لے کر فنکار کے ذہن پر نازل ہوتا ہے۔اُس زمانے میں اگر چہ ع س مسلم شاعری بھی کرتے تھے اور تہذیبی وثقافتی اور سیاسی ومعاشرتی مسائل پر مضامین بھی لکھتے تھے، مگر اُنہوں نے جو موضوعات اپنے افسانوں میں پیش کیے۔کوئی اور صنف اِس کی متحمل نہ ہوسکتی تھی۔ اِس کی وجہ جہاں ذوقِ داستاں سرائی ہے وہاں سیدھے سادے انداز میں بعض مسائل کی قاری تک تفہیم بھی ہے۔

کہانی کے سلسلے میں اُن کا اپنا نظریہ یہ ہے:

''کہانیوں کے سلسلے میں میرے نزدیک اہم بات یہ ہے کہ مصنف کسی کردار کے متعلق جو کچھ کہنا چاہتا ہے۔اُسے قاری تک سیدھے سادے دلچسپ پیرائے میں پہنچا دے--- زمانے کی فضا اکثر سازگار نہیں ہوتی اور مجھ جیسے ازلی باغی کو لڑ جھگڑ کر اپنے لیے ایک مقام پیدا کرنا پڑتا ہے۔اِس عمل میں جن تجربوں، تلخیوں اور حقائق سے دوچار ہونا پڑا، یہ کہانیاں اُن کا عکس ہیں۔یہی وجہ ہے کہ میں نے حقائق کو جیسے دیکھا، سیدھے سادے طریقے سے بیان کر دیا، گندے ناسوروں سے چشم پوشی نہیں کی، بلکہ ان کی پٹیاں چیر کر انہیں عریاں کر دیا، تاکہ اصلیت پوشیدہ نہ رہے۔ میں کیمرہ نہیں، جو اپنے کردار کے خدوخال کی بے جان اور بے حس سی تصویر اُتار دوں، اگر اپنے کرداروں سے ہمدردی جُرم ہے، تو میں نے اس جُرم کا ارتکاب اکثر کیا ہے۔اس لیے، کہ میرے کردار میری ہی طرح کے جیتے جاگتے انسان ہیں،۔۔غلطی وگناہ کے پُتلے انسان--- مجھے اُن سے ہمدردی ہے''۔(حرف اول)

ع س مسلم نے اپنے کرداروں کو بنا سنوار کر پیش نہیں کیا اور نہ ہی کسی نظریاتی فکر کو اِن کے ذریعے قاری تک پہنچانے کا تردد کیا ہے۔ بلکہ سیدھے سبھاؤ اِن کے کردار زندگی سے قریب تر رہتے ہوئے اپنے خالق کے ''بیانیہ'' کے زیر اثر رہتے ہیں۔ یہ کردار، عمل اور مکالمے کے بجائے زیادہ تر لکھنے والے کے مافی الضمیر کے مطابق سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔اس سلسلے میں ایک بات جو سب سے اہم ہے وہ اِن کا دلچسپ اندازِ بیان ہے۔کردار کوئی بھی ہو اُن کے عمل میں ہم لکھنے والے کی جھلک محسوس کرتے ہیں۔ یہاں ایک بات یاد آرہی ہے جو انگریزی خواں طبقے کے علم میں ہوگی کہ بائرن سے کسی نے پوچھا کہ آپ انگریز لوگ شیکسپیئر پر بہت فخر کرتے ہیں اور بات بات پر اُس کی مثالیں دیتے ہیں اُس کے اصل الفاظ تھے کہ:

Tell me in a single sentence who Shakespeare was.He replied, why not in a half sentence, our million minded Shakespeare

بائرن کی یہ بات شیکسپیئر کی کردار نگاری کے حوالے سے تھی جس میں ہملٹ، سیزرز، میتھلو، بروٹس سے لے کر فالسٹاف جیسے مزاحیہ کردار پائے جاتے ہیں۔میں جب ع س مسلم کی متنوع تخلیقی صلاحیتوں کا جائزہ لیتی ہوں تو مجھے بھی ایک حوالے سے اُن کے افسانوی کردار متاثر کرتے ہیں--- زندگی میں آگے بڑھنے کی لگن لیے ہوئے کردار--- ذہنی اور جذباتی کشمکش میں گرفتار کردار--- سماجی زندگی کا ڈھانچہ بدلنے کا عزم لیے ہوئے کردار---خصوصاً حصولِ تعلیم کے بعد روزگار کے حصول

تک کے مسائل سے نبرد آزما ہونے والے کردار--- منافقت میں بٹے ہوئے اخلاقی قدروں کو پائمال کرنے والے کردار--- اور عزت کو سرِ عام نیلام کرنے والے کردار--- اُن کی چودہ کہانیوں میں بحیثیت مجموعی ایسے بیسیوں کردار ہیں جو اجتماعی زندگی کے تغیرات سے جنم لیتے ہیں اور اپنی انفرادی نفسیات کے حوالے سے اجتماعی سطح پر سماجی مسائل میں جکڑے ہوئے ہیں اور ایک حوالے سے اپنی ضرروتوں کی راہنمائی میں سرگرمِ کار ہیں۔ تاہم وہ اپنے ماحول، جذباتی گھٹن، مالی پریشانیوں، سماجی ناانصافیوں اور طبقاتی پستیوں کے بوجھ کے باوجود آگے بڑھنے کا عزم رکھتے ہیں۔

کردار نگاری اور موضوعات کے علاوہ اُن کے افسانے اپنے اسلوب کی وجہ سے اپنی ایک جداگانہ شناخت رکھتے ہیں۔ اُن کا اسلوب مبہم اور علامتی نہیں، بلکہ سادگی کی انتہا کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ کہانیاں لکھنے کے لئے نہیں بلکہ سُنانے کے لئے تخلیق کی گئی ہیں۔ الفاظ کا انتخاب، فقروں کی ساخت اور موضوع کی مناسبت سے پیراگرافنگ تک ایک فطری انداز لیے ہوئے ہے۔ یہ انداز ایک تیزی سے پھیلتے اور بڑھتے ہوئے معاشرے میں اُس سفید پوش گھرانے کے بالغ نظر فرد کے کردار کو ظاہر کرتا ہے جسے زندگی میں آگے بڑھنے کی تمنا ہے۔ یہ آگے بڑھنا اِس طرح ہے کہ پرانی بچی کھچی قدروں کا رختِ سفر بھی ساتھ رہے۔ اور تیزی سے بھاگتی ہوئی زندگی پر بھی فرد کی گرفت رہے۔

ع س مسلم کا یہ اسلوب زیادہ تر بیانیہ پر مشتمل ہے اِس میں کہیں کہیں خود کلامی کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ موضوع کے بارے میں اُن کی زیادہ تر معلومات مکالمے کے ذریعے سے نہیں بلکہ بیانیے کے ذریعے سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اکثر کہانیوں میں اُن کا اپنا کردار کہانی کے پس منظر سے جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اُن کا بیانیہ حقیقت پسندانہ بیانیہ ہے جو سنجیدگی اور متانت کے اوصاف سے متصف ہے۔ اُنہوں نے کہیں بھی افسانہ نگاری بطور افسانہ نگاری نہیں کی۔ بعض تجربات و مشاہدات جن کا بیان ضروری خیال کیا اُنہیں افسانوں کی زبان میں بیان کر دیا۔ اُن سے اسلوب میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کی بازیافت کا تذکرہ ملتا ہے۔ زندگی کے بارے میں حقیقت پسندانہ پیش رفت اُن کے اسلوب کا خاصہ ہے۔

ان کے بیانیہ میں منظر کشی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں خاص طور پر دیہاتی زندگی کی حقیقت پسندانہ نقشہ کشی جو ہمارے نوجوان افسانہ نگار کے شعور اور لاشعور میں بسی ہوئی تھی کہ اُس کا بچپن، لڑکپن اور جوانی انہی راہوں، راستوں اور پگڈنڈیوں پر گزری تھی۔ اور پھر لڑکپن کے وہ سانجھی ساتھی اور بچپن کی بے لوث دوستیاں جو یادوں کی سکرین پر ساری زندگی ایک تواتر کے ساتھ سلولائیڈ فلم کی طرح چلتی رہتی ہیں۔ ایک ایک جذباتی یاد کو افسانہ نگار جگہ جگہ اپنے قارئین سے شیئر کرتا ہے منظر نگاری کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ''مجھے اپنا گھر یاد آنے لگا۔ اونچا نیچا گاؤں--- ٹیڑھے میڑھے رستے--- عشق پیچاں کی بیل کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں--- وہ میری محبت کی راہ گزاریں--- ہرے بھرے کھیت، سنہرے گدرائے ہوئے کھیت، میری جوانی کی پروان گاہ--- یہاں میری جڑیں تھیں، یہ میری جان تھی، اور میں نے جان کی بازی لگادی تھی، اس منزل کے لیے--- اور پھر وہ خوشیا--- شریف--- اور سردارا سب میرے جگری یار--- سردارا جو

بانسری اور الغوزوں کا متوالا تھا جو انہیں لوگڑی کے مصنوعی پھولوں سے سجا کر رکھتا، گلے میں کنٹھا اور تعویذ پہنتا ---کہاں ہیں وہ---؟ میرے یار---میری باہیں''۔ (''مٹھی بھر مٹی''، ص 134)

اُس زمانے میں جب اخلاقی بے راہ روی اور جنسی مسائل پر افسانہ لکھنے کا عام رواج تھا انہوں نے اعلیٰ اخلاقی قدروں کو بین السطور ملحوظ رکھا ہے۔ اُن کے افسانوں کے واقعات کا اظہار جس انداز میں ہوا ہے یہ اظہار مایوسی کی بجائے زندگی پر ہمارے اعتماد کو اور پختہ کرتا ہے۔ اُن کے اسلوب میں بات کو آگے بڑھانے کا جوہر نمایاں ہے۔ کچھ لفظوں میں بات کو سمجھنے کی بجائے وضاحت پسندی کا عنصر نمایاں ہے۔ بعض اہم نفسیاتی مسائل پر مشتمل افسانوں کو انہوں نے بڑی آہستگی اور ہموار پن کے ساتھ بیانیہ کا حصہ بنایا ہے۔ اُن کے لب و لہجے میں کہیں کہیں تیزی بھی ہے اور جذبات کی گرمی بھی، لیکن ایک وضاحت اور سادگی کا وصف ہر جگہ نمایاں ہے۔ اگر انہیں افسانہ نگاری پر زیادہ وقت صرف کرنے کا موقعہ ملتا تو یقیناً وہ اپنی شاعری کی طرح اس میں بھی نمایاں نام پیدا کرتے۔ تاہم موجودہ صورت میں بھی مقدار کی کمی کے باوجود یہ افسانے معیاری قدروں کی نشان دہی کرتے نظر آتے ہیں۔

مسلم کی افسانہ نگاری کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ کہانی کار کے لیے کہانی ایک مقدس تخلیقی فرض ہے۔ یہ فرض نیکی اور خیر کی منزلوں کے حصول کا ہے اس سفر پر نکلنے والوں کے لیے عزم و ہمت اور مسلسل جدوجہد اور کوشش اُس کا زادِ راہ ہے یہ سارے کردار کسی نہ کسی حوالے سے کہانی کار کے ساتھ جڑے ہوئے کردار لگتے ہیں۔ خیر و شر کی اس آویزش میں ایک بنیادی کڑی کہانی کار کی حوصلہ مندی ہے۔ جو اُس کے کرداروں کے ذریعے قارئین تک منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ع س مسلم نے اپنی کہانیوں میں بھی واقعات کے بیان کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے کردار اور کہانیوں کو مقصدیت سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اگر ان کہانیوں کو اُس تاریخی تناظر میں دیکھا جائے جس میں یہ لکھی گئیں تو ہمیں واقعی ان کے اندر روحِ عصر کا عکس نظر آتا ہے۔ کشمکش میں گھرے ہوئے معاشرے---نئی منزلوں کی طرف لٹے پٹے قافلوں---بکھرتی، ٹوٹتی دم توڑتی زندگی کو جس اعلیٰ نصب العین کی ضرورت تھی اُس کی چاپ ہمیں ان کہانیوں میں ملتی ہے۔

ع س مسلم نے بعد کی زندگی میں اگرچہ افسانے نہیں لکھے، یا لکھے تو پھر شائع نہیں کیے لیکن آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کی یہ کہانیاں آج بھی قاری کو اپنے گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ ان افسانوں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے رومانویت، بے مقصدیت اور نام نہاد ترقی پسندی کے برعکس اپنی کہانیوں میں ایک سماجی شعور دیا، ایک ایسا شعور جو نہ صرف حقیقت کے ساتھ جڑا ہوا ہے بلکہ یہ حقیقت بھی کوئی مابعد الطبعیاتی یا نام نہاد آفاقی حقیقت نہیں بلکہ 40 اور 50 کی دہائی میں اپنے اردگرد کی ایک ایسی قریبی حقیقت ہے جس سے کروڑوں لوگ متاثر ہوئے اور لاکھوں لوگ اس تجربے سے گزرے۔ ع س مسلم کی کہانیاں اپنے زمانہ تخلیق کا سچا احوال نامہ ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف واقعات کا سچا بیان ہیں وہاں زندگی کو مقصد سے آشنا کرنے کا درس بھی دیتی ہیں---اور آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی۔

.....☆.....

# ع۔س مسلم کے ''کالمی'' موضوعات اور استعارے

ڈاکٹر محمود الحسن عارف☆

**Abstract:**

There are many kinds of columnists. Some are writing, only without any purpose, some are attached with different schools of thought and they are advocating their schools of thought in their columns, but Abul-Imtiaz, A.S. Muslim is a columnist, who is patriotic and who is writing, on National issues. He tries through his columns, to communicate some messages to his nation, such as what are the duties of common man and what are the liabilities of the stat's men and the leaders of the Nation, etc. The article comprises upon some details of the subject.

یہ بات ابھی تشریح طلب ہے کہ دنیا میں کالم نگاری کی ابتدا کب اور کہاں سے ہوئی.....اس میں شک نہیں کہ یہ ایک جدت ہے جس کا سہرا یقیناً اہلِ مغرب کے سر ہے۔ تاہم اس بارے میں اردو زبان بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ کیا ہوا اگر اس کی عمر کم ہے اور کیا ہوا اگر اس کی صحافیانہ زندگی کا قافیہ زیادہ کشادہ نہیں ہے.....مگر یہ کیا کم ہے کہ اس وقت جتنی دھواں دار کالم نگاری اردو زبان میں ہوئی ہے، اتنی زوردار، شاندار اور ہمہ گیر کالم نگاری شاید ہی کسی اور زبان میں ہوئی ہو۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو میں کچھ عرصے سے بے مقصد کالم نویسی کا رجحان بڑھ رہا ہے اور زیادہ تر لوگ کالم نویسی کے روپ میں مضمون نگاری کرتے ہیں اور یہ لوگ اپنے کالموں کے ذریعے مخالفین کے خلاف ایک طرح کی کُشتی لڑتے ہیں اور انہیں چت کرنے کی کوشش کرتے ہیں،.....اس طرح ''کالم نویسی'' کا میدان بھی

☆ صدر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جامعہ پنجاب لاہور

ایک طرح کا اکھاڑہ بن گیا ہے۔

اس پس منظر میں علامہ ابوالامتیاز ع۔س مسلم کی شخصیت بڑی منفرد اسلوب کی حامل ہے۔ان کا شمار وطن عزیز کے ان قابل قدر ''کالم نویسوں'' میں ہوتا ہے جنہوں نے کالم نگاری کو ایک مقصد اور مشن کے تحت اپنایا، انہوں نے اس کے میدان میں اُس زمانے میں قدم رکھا تھا، جب کالم نویسی کا سلسلہ ابتدائی مرحلے میں تھا اور ابھی ''حسن'' پرستی کو بولہوسوں نے شعار بنایا تھا اور نہ ہی آبروئے شیوۂ اہل قلم گئی تھی۔اسی لیے وطن عزیز میں جب کبھی بھی کالم نگاری کی کوئی معتبر تاریخ لکھی جائے گی تو.....ع۔س مسلم کا نام اس میں سرفہرست مقام پر جگہ پائے گا.

## ع۔س مسلم کے موضوعات:

بہر حال دور خواہ موجودہ ہو یا سابقہ ایک بات سب ادوار میں قدر مشترک ہے وہ کہ کالم نگاروں کی اس ہما ہمی میں سب سے پہلا اور اہم مسئلہ موضوع کے انتخاب کا ہے، اچھا کالم نویس وہ ہوتا ہے جو موضوع کے انتخاب میں بڑی ہنرمندی سے کام لیتا ہے۔ع۔س مسلم کو اللہ تعالیٰ نے موضوع کے انتخاب میں بھی بہت اچھا سلیقہ عطا کیا ہے اور انہوں نے اپنے کالموں کے موضوعات بہت سوچ سمجھ کر انتخاب کیے ہیں.....ان کے کالموں کے موضوعات زیادہ تر جذبۂ حب الوطنی اور تعمیرِ ملت کے گرد گھومتے ہیں.....مثلاً ''کیا اسلام پاکستان میں اجنبی ہے''(۱)۔ فطرت کی طرف لوٹیے (۲)۔ عیسائی برادران کے لیے لمحۂ فکریہ (۳)، اسلامی قومیت اور اس کے عملی مضمرات (۴)، کاروان پاکستان (۵)، اس طرح کے موضوعات کا انتخاب کر کے وہ ''تعمیرِ ملت'' کے اس عظیم الشان کام کو انجام دینا چاہتے ہیں جو ملک کی بنیاد اور اساس کا کام دیتا ہے.

ع س مسلم نے..... پاکستان کو اپنی آنکھوں سے بنتے دیکھا ہے۔وہ ہندو اور اس کی ذہنیت کو خوب سمجھتے ہیں.....وہ ''قیام پاکستان'' کی تحریک سے، دوسرے لوگوں کی زبانی سن کر یا دوسروں کی آپ بیتی پڑھ کر واقف نہیں ہوئے، بلکہ یہ سب کچھ ان کی آنکھوں نے کھلے بندوں دیکھا تھا۔وہ اس نسل کے نمائندہ ہیں جنہوں نے قیام

۱۔ ابوالامتیاز، ع س مسلم، نبض ضمیر، القمر انٹر پرائزز، اردو بازار، لاہور، بار اوّل ۲۰۰۳، ص ۳۳۔

۲۔ ایضاً، ص ۵۴

۳۔ ایضاً، ص ۳۳

۴۔ زبور خیال، ص ۳۳

۵۔ ایضاً، ص ۵۵